ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی☆

# ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

## علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری کی آٹھویں برسی پر ایک خصوصی تحریر

**دنیا** دار الفنا اور آخرت دار البقا ہے، جو بھی اِس ناپائیدار دنیا میں آیا ہے، اُسے لوٹ کر اپنے رب کی بارگاہ میں واپس جانا ہی ہے، یہی دنیا کا ازلی ابدی دستور ہے- ایسی باتیں سنی اور پڑھی ہوئی تھیں لیکن موت کی فنائیت اور آخرت کا تصور جس طرح دل و دماغ میں ۱۸ شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ کو ثبت ہوا، پہلے ایسا نہ تھا، موت جیسی حقیقت جیسے اس تاریخ کو سمجھ آئی، پہلے کبھی میرے ادراک کے دائرے میں نہ تھی، اِس تاریخ کو درشتی اور کرختگی سے کوسوں دور رہنے والی ایک متوازن اور معتدل شخصیت، ہمارے سراپا لطف و کرم، مشفق اور مربی استاد، اور والد گرامی حضرت علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے، علم و عمل، عجز و انکسار، تقویٰ و طہارت اور محبت و اخلاص سے عبارت زندگی گزار کر چلے گئے، اُن کے سفرِ آخرت کے حوالے سے فیض احمد فیضؔ کا درج ذیل شعر معمولی سی تبدیلی کے ساتھ دل و دماغ میں بار بار گونجتا ہے:

جس دھج سے کوئی مدفن میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اِس جان کی کوئی بات نہیں

اُنہیں اپنی لاعلاج بیماری ''کینسر'' کا علم تھا، لیکن اِس کے باوجود اُن کے عزم اور حوصلے میں لچک نہیں تھی، اُن کے دل و دماغ میں مایوسی نام کی کوئی چیز نہ تھی، اُنہوں نے بیماری کی شدت میں بھی قلم و قرطاس سے ناطہ نہیں توڑا، حالاں کہ بعض اوقات تحریر کے دوران جبڑے میں شدید تکلیف شروع ہو جاتی تھی تب تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتے یا جبڑے پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے اور جونہی درد کی شدت کم ہوتی دوبارہ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے- ہم اُن کی ذات میں کمال کا صبر، ضبط اور حوصلہ دیکھتے رہے ہیں، بعض اوقات رات میں اُن کی آنکھ کھل جاتی تو وضو کر کے ترجمۂ قرآن میں مصروف ہو جاتے جو اُنہوں نے اپنی مضبوط قوت ارادی اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مکمل کر لیا تھا- الحمدللہ یہ ترجمہ ''انوار الفرقان فی ترجمة معانی القرآن'' کے نام سے جنوری ۲۰۱۵ء میں شائع ہو چکا ہے، آپ نے دینی خدمت کے میدان میں عزیمت کے راستے پر چلتے ہوئے ایک بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری-

آپ پر خشیت ایزدی کا غلبہ تو ہمیشہ ہی رہا تھا، فکرِ آخرت کا تصور بھی آپ کے دل و دماغ میں راسخ تھا- ۲۰۰۴ء میں الازہر یونیورسٹی میں میرا پی ایچ ڈی کا مناقشہ (Viva) ہوا تو آپ بذاتِ خود وہاں تشریف لے گئے اور مناقشہ کے دوران کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں میرے سامنے تشریف فرما تھے، وائیوا کے بعد جب نتیجے کا اعلان ہوا تو اُن کی خوشی دیدنی تھی، وہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سربسجود نظر آ رہے تھے، پھر ایک دن اِس کامیابی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اُن پر گریہ طاری ہو گیا، میں حیرت میں ڈوبا ہوا خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا، تب انہوں نے خود ہی فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو اتنی عظیم کامیابی عطا فرمائی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری اِس کامیابی کی صورت میں میرے عمر بھر کے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیا گیا ہو-''

تب میں ہمت مجتمع کر کے یوں عرض گزار ہوا:

''اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے، وہ آپ کو دنیا اور آخرت میں بہترین اجر عطا فرمائے گا-''

لالہ زار کالونی، لاہور میں گھر تعمیر ہوا تو ایک دن اُس کے حوالے سے بھی متعدد احباب سے ایسے ہی کلمات ارشاد فرمائے، کبھی جمعرات کی شام محفلِ ذکر میں آنے والوں کے لیے گھر میں اچھا کھانا پکوایا ہے تو اُسے مہمانوں کے ساتھ کھاتے ہوئے بھی یہی کیفیت طاری ہو جایا کرتی اور آپ خشیت ایزدی میں ڈوبے ہوئے نظر آتے- مجھے گمان ہوتا ہے

کہ آپ کا یہ طرزِ فکر صحابہ کرام کی زندگیوں سے مستفاد ہے، کیونکہ اُن کا یہ معمول تھا کہ جب بھی انہیں کوئی نعمت ملتی وہ اِس فکر میں ہوتے تھے کہ کہیں یہ نعمت دنیا میں ہی اُن کے اعمال کا بدلہ نہ ہو- کسی بھی نعمت کے حصول پر انہیں یہ فکر ہوتی کہ اس نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا، یوں محسوس ہوتا جیسے سورۂ تکاثر کی آخری آیت ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم ہر وقت اُن کے سامنے رہتی تھی، اور یوں بھی محسوس ہوتا تھا کہ جیسے قیامت کے دن مال کے بارے میں کیا جانے والا سوال ''مال کیسے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟'' بھی ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہتا تھا-

وہ ہستی جس نے تیس سال سے زیادہ عرصہ قرآن و حدیث کی تعلیم دینے میں گزارا ہو، جس ہستی کے سینکڑوں شاگرد ملک اور بیرون ملک منبرِ رسول پر بیٹھ کر دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوں، دین کا جھنڈا بلند کر رہے ہوں، مسند تدریس پر بیٹھ کر قال اللہ اور قال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند کر رہے ہوں، جس ہستی کے سیکڑوں تلامذہ اُس کے لیے صدقہ جاریہ ہوں، جس شخصیت کا لمحہ لمحہ دینی خدمت میں گزرا ہو، اگر ہم ایسی شخصیت کو خشیت ایزدی کے زیر اثر عجز و انکسار اور خوفِ خدا جیسی نعمت سے مالا مال دیکھتے ہیں تو یہ مالک کا کرم بالائے کرم ہی ہے-

زندگی اور موت کے حوالے سے اُن کا تصور بہت واضح تھا اور وہ آخرت کے حوالے سے اتنے فکر مند تھے کہ وہ احباب سے اِس بات کا تذکرہ بھی فرماتے، میں اُن کی لکھی ہوئی ایک ڈائری دیکھ رہا تھا کہ اُن کی ۳؍جنوری ۲۰۰۳ء کی لکھی ہوئی درج ذیل تحریر میرے سامنے آئی:

''جب سے اِس مکان (لالہ زار فیز II) پر آیا ہوں موت کا خوف ذہن پر سوار رہتا ہے، صبح تین چار بجے آنکھ کھل جاتی ہے، حسبِ توفیق وضو کر کے تہجد کی چھ یا آٹھ رکعتیں پڑھتا ہوں، حضرت خواجہ محمد صادق صاحب مدظلہ سے رابطہ ہے، وہ کرم فرماتے ہیں، اِسی طرح پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب سے بھی رابطہ ہے-''

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے تربیتی نقطۂ نظر سے فرمایا:

''مجھے موت اور آخرت کے حوالے سے کبھی کبھار خوف سا محسوس ہوتا تھا، میں نے شیخ المشائخ حضرت خواجہ محمد صادق صاحب کو ایک خط کے ذریعے اپنی اِس کیفیت سے آگاہ کیا تو آپ نے مورخہ ۲۴ جنوری ۲۰۰۲ء کو لکھے گئے مکتوب میں فرمایا:

''مکتوب ملا، اللہ شفا دیں اور موجودہ گھبراہٹ اور اضطراب سے نجات دیں، آپ کا نصف شب میں بیدار ہونا اور فکرِ آخرت میں غلطاں ہونا بھی اُسی کی جانب سے ہے تاکہ آپ اُس کے حضور عجز و نیاز کا دامن پھیلا سکیں، رب کریم یہ مبارک ساعات خوش بختوں کو عطا کرتے ہیں اور انہیں اپنی رحمت سے نوازتے ہیں- حدیث قدسی میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اے میرے بندے اگر تو زمین اور آسمان کے برابر بھی گناہ لے آئے اور مجھ سے مغفرت چاہے تو میں سب گناہوں کہ بخش دوں گا اور گناہوں کی کثرت کی پرواہ نہ کروں گا-'' آپ...... اِس فکرِ آخرت کو غنیمت جانیں، مومن کی زندگی یوں بھی بیم و رجا کا مرکب ہے، اُس کی رحمت پر ناز اور اپنے گناہوں پر ندامت رہے، دنیا اور آخرت تو دونوں اُنہیں کے ہیں- اُنہیں اختیار ہے دنیا میں رکھیں یا آخرت میں بلالیں، کوشش یہی ہونی چاہیے کہ اُس کی رضا کے اہل ٹھہریں جس کا اہتمام آخرت میں کیا گیا ہے- اللہ تعالیٰ آپ کی دینی خدمات قبول فرمائے اور اُس کے صلے میں دنیا اور آخرت میں آسودگی عطا فرمائے اور ہر چھوٹی بڑی ابتلا کو بلند درجات کا ذریعہ بنائے- اورادِ فتحیہ اور دلائل الخیرات دونوں کی نسبت بزرگوں سے ہے اور فیوض و برکات کے حامل وظائف ہیں، اب آپ کی صحت اور فرصت پر منحصر ہے، اپنے حالات کی روشنی میں جو فیصلہ کریں، اجازت ہے-''

حضرت قبلہ والد گرامی نے پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اپنی اِس کیفیت کا اظہار فرمایا تو آپ نے (مورخہ ۱۲ جنوری ۲۰۰۳ء کو) جواب میں تحریر فرمایا:

''موت کی یاد ہشیاری اور بیداری کی دلیل ہے، ورنہ اکثر جاگنے والے بھی سو رہے ہیں، وہ بڑا کریم ہے، اُس سے کرم ہی کی امید کی جاسکتی ہے، چاہنے والوں پہ عنایت کہ وہ چاہے تو سارے گناہ معاف کر دے، وہ سب پر کرم فرماتا ہے، پھر وہ جس کا سونا عبادت ہے، جس کا پڑھانا عبادت ہے، جس کے قلم کی روشنائی خونِ شہیداں سے افضل ہے، وہ اُس کے کرم سے کیسے محروم رہ سکتا ہے؟ اِن شاءاللہ سب منزلیں آسان ہوجائیں گی، بس خیال میں وہی بسا رہے-''

بقیۃ السلف حضرت خواجہ محمد صادق نقش بندی اور پروفیسر ڈاکٹر

محمد مسعود احمد رحمۃ اللہ علیہما کے اِن کلمات سے ایسی تسکین ہوئی کہ گھبراہٹ کی شدت ختم ہوگئی، مگر آخرت میں جواب دہی کا احساس بہر حال موجود رہا- میں نے فکر آخرت کا یہ احساس حضرت خواجہ محمد صادق اور حضرت والد گرامی کے علاوہ بہت کم دیکھا، اللہ ہم سب کو اِس احساس کی نعمت اور برکتوں سے مالا مال فرمائے-

وصال سے کچھ عرصے پہلے ایک مرتبہ آپ نے تمام اہل خانہ کو جمع کر کے نہایت اطمینان سے فرمایا:

''میرا آخری وقت آجائے تو میرا چہرہ خانہ کعبہ کی طرف کر دینا، آنکھیں بند کر دینا اور صبر کا دامن تھامے رہنا-''

اِس نصیحت کے بعد آپ نے اپنے بستر کا رخ بھی تبدیل کر دیا، پہلے تو آپ کا سر مغرب کی طرف اور پاؤں مشرق کی طرف ہوتے تھے مگر اب سر شمال کی طرف پاؤں جنوب کی طرف ہو گئے، آپ اِس طرح شعوری طور پر اِس لیے سوتے تھے کہ جب آخری وقت آجائے تو چہرے کو خانہ کعبہ شریف کی طرف پھیرنے میں دِقت اور تاخیر نہ ہو-

ایک دن مجھے فرمانے لگے:

''دیکھو بیٹا! اگر مجھ سے تمہارے معاملے میں کوئی زیادتی ہو گئی ہو تو مالی، جسمانی، زبانی جیسا چاہو بدلہ لے کر مجھے معاف کر دینا-''

میں یہ بات سن کر ہکا بکا رہ گیا اور کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہا، اِس سے پہلے کہ میں کچھ بات کرتا، گفتگو کا رخ تبدیل ہو گیا، لیکن چند دنوں کے بعد حضرت والد صاحب سب گھر والوں کو جمع کر کے وہی بات دھرا رہے تھے اور اُن سب کی یہ کیفیت تھی کہ کسی میں تابِ گویائی نہ تھی، تب میں یوں عرض گزار ہوا:

''ہم تو آپ کی شفقتوں کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے، بدلہ لینے کا تصور ہی نہیں ہے-''

حضرت والد گرامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نہایت اطمینان سے فرمایا:

''اگر حضور ﷺ اپنا مبارک سینہ کھول کر بدلے کے لیے پیش فرما سکتے ہیں تو میں کیا چیز ہوں؟''

میں نے سب کی طرف سے گزارش کی:

''ہم آپ سے راضی ہیں، اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب ﷺ آپ سے راضی ہوں- ہماری آپ سے بھی یہ گزارش ہے کہ اگر ہم سے کوئی کمی، کوتاہی ہو گئی ہو تو آپ بھی ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے معاف فرما دیں-''

یہ سن کر انہوں نے عربی میں یہ دعائیہ جملہ ارشاد فرمایا:

''یغفر اللہ لنا ولکم.'' اللہ ہمیں اور آپ کو معاف فرمائے-

آپ کے وصال سے تین دن قبل میں فیصل آباد میں تھا، شب براءت کے موقع پر میں نے فون پر آپ سے دعاؤں کے لیے درخواست کرتے ہوئے گزارش کی:

''میری خواہش تھی کہ آج رات میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا لیکن ایک شب براءت کی چھٹی نہیں ہوتی اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ رات ہفتے کے درمیان ہے چھٹی کے دن اتوار سے قریب نہیں اس لیے میں حاضر نہیں ہوسکا-''

تو آپ نے بہت دعاؤں سے نوازا پھر فرمایا:

''دیکھو اس رات میں زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں، نہ جانے اِس رات میں میرے حوالے سے کیا فیصلہ ہو-''

اِس کے بعد انہوں نے پھر وہی بات دھرا دی جس کا میں نے چند سطر پہلے ذکر کیا ہے، تب بھی میں نے اُن سے گزارش کی تھی:

''اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب ﷺ آپ سے راضی ہوں اور اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر تا دیر سلامت رکھے، ہم سب آپ سے راضی ہیں-''

میں اِس کیفیت پر آج تک حیران ہوں، اُنہیں آنے والے وقت کا اندازہ ہو گیا تھا، میں یہ بات کسی اندازے کی بنا پر نہیں کہہ رہا بلکہ ایک روایت کو نقل کر رہا ہوں، حضرت والد گرامی کے حوالے سے محترمہ والدہ صاحبہ مدظلہا نے بتایا:

''انہوں نے چند مرتبہ کسی گھبراہٹ کے بغیر فرمایا تھا کہ اَب تھوڑے ہی دن باقی ہیں-''

وہ موت سے خوف زدہ نہیں تھے، خوفِ خدا تو اُنہیں ہمیشہ نصیب رہا، روزِ قیامت کی ہیبت بھی مسلمہ ہے، اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے دل و دماغ میں دنیوی زندگی کی بے ثباتی کی طرح برزخی اور اُخروی زندگی کی ابدیت کا تصور کس قدر واضح تھا، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ دنیا دار المحن ہے اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ موت کا ذائقہ چکھنے

کے بعد ایک نئی اور پرسکون زندگی شروع ہو جاتی ہے۔

ہمارے ایک دوست مولانا فیاض احمد نقش بندی نے بتایا کہ حضرت والد گرامی نے وصال سے کچھ عرصے پہلے انہیں احسان دانش کا یہ شعر سنایا تھا:

دانش میں خوف مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضور کی

ایک مرتبہ انہوں نے اپنی تکلیف اور بیماری کی کیفیت کے حوالے سے کچھ بتایا تو ہمشیرہ صاحبہ رونے لگیں، تب والد کی طبیعت بیٹی کا کرب دیکھ کر مضطرب ہوگئی، آپ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

''بیٹا معاف کرنا، میں نے تو تمہیں پریشان ہی کر دیا۔''

ایک مرتبہ انہیں ہی فرمایا:

''دیکھو بیٹا میں انگلینڈ گیا تھا تو جسمانی طور پر آپ سے دور تھا، مگر آپ سب کے دلوں میں محبت برقرار تھی، اِسی طرح جب انسان دنیا سے چلا جاتا ہے تو دلوں میں یاد رہ جاتی ہے۔''

ہمشیرہ کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا تو والد صاحب نے ڈھارس بندھاتے ہوئے فرمایا:

''بیٹا میں تو تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں، میں تو تمہیں ایک بات سمجھا رہا تھا۔''

اِس طرح انہوں نے انتہائی خوبی سے ڈھارس بھی بندھا دی اور ایک حقیقت بھی سمجھا دی، ایک حقیقت جس سے فرار ممکن ہے نہ اُس کا انکار ممکن ہے۔

انہوں نے اپنے وصال سے تقریباً تین ہفتے قبل مجھے فرمایا:

''میرے اکاؤنٹ میں جو تھوڑی سی رقم ہے، اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کروالو اور مجھے کچھ چیک دستخط کر کے دے دو تا کہ ضرورت کے وقت مطلوبہ رقم نکلوالوں، بینک والے بعد میں پریشان کرتے ہیں۔''

یہ بات سن کر میرا ضبط کا پیمانہ چھلک گیا، مجھ سے جذبات پر قابو نہ رہ سکا اور پھر وہ خود ہی مجھے دلاسہ دے رہے تھے، انہوں نے فرمایا:

''ذرا اُن بچوں کے بارے میں سوچو جو پاکستان میں ۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو تاریخ کے شدید ترین زلزلے میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئے، اُنہیں بھی چھوڑو، رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوچو اور صبر سے کام لو۔''

اِسی طرح ایک دن مجھے فرمانے لگے:

''میرا جنازہ کون پڑھائے گا؟''

یہ بات سن کر میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے، تب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے:

''یہ وقت تو ہر ایک پر آنا ہے، حوصلہ رکھو۔''

پھر مجھے دلاسہ دینے کے بعد فرمایا:

اگر حضرت سید امین میاں مدظلہ العالی تشریف لاسکیں تو بہت اچھا ہو، لیکن اُن کا آنا مشکل ہوگا، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب اور حضرت پیر فضل رسول حیدر صاحب بیمار ہیں، وہ دونوں تشریف نہیں لا سکیں گے، البتہ حضرت علامہ سید حسین الدین شاہ صاحب مدظلہ العالی جو اسلاف کی یادگار ہیں وہ تشریف لاسکیں تو زہے نصیب، وہ بھی تشریف نہ لاسکیں تو پھر تم خود جنازہ پڑھانا۔''

آپ نے یہ ساری باتیں نہایت اطمینان کے ساتھ فرمائیں اور اُن کا یہ اطمینان میرے لیے اُس وقت بھی حیرت اور تعجب کا باعث تھا اور آج بھی ہے، اُن کا یہ اطمینان میرے لیے ہمیشہ ایک روشن چراغ بنا رہے گا، یہ اطمینان راسخ ایمان کے ثمرات میں سے ہے۔

آپ کی بڑی پوتی کو آپ کی بہت شفقت نصیب ہوئی، اگر کبھی وہ بچی اپنے ننھیال جاتی تو والد صاحب گھر میں اُس کے لیے پریشان رہتے اور اِس بچی کو بھی اگر ننھیال میں زیادہ دن ٹھہرنا پڑ گیا تو وہ بھی دادا ابو کے پاس واپسی کا تقاضا کرنے لگتی، ایک دن حضرت والد صاحب نے فرمایا:

''میں سوچتا ہوں اگر مجھے کچھ ہوگیا تو اِس کا کیا بنے گا؟''

میں نے عرض کیا:

''اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور بچوں کی خوشیاں دکھائے۔''

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر میری افسردگی کے پیش نظر خاموش ہو گئے، آپ اپنی دونوں بیٹیوں پر بہت شفقت اور دونوں کے لیے خصوصی دعائیں فرمایا کرتے تھے، اِن دونوں کے حسن ادب سے بہت خوش تھے۔ اِن کے علاوہ دو اور بچیاں حضرت حضرت والد صاحب کی خیریت وقتاً فوقتاً پوچھتی رہتی تھیں، اُن میں سے ایک تو آپ کو ابو جی کہہ کر پکارتی

تھی اور وہ چند مرتبہ اپنے بھائی، والد صاحب یا اپنے خاوند کے ساتھ آپ کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھیں، ایک مرتبہ حضرت والد صاحب نے فرمایا:

''میں سوچتا ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو دونوں بیٹیوں کو صدمہ ہوگا ہی، ان دو منہ بولی بیٹیوں کو بھی صدمہ ہوگا، انہیں، بڑی پوتی اور تمام اہل خانہ کو کہنا میرے پاس آ کر نہ رونا۔''

ایک مرتبہ میں اُن کے قریب ہی بیٹھا تھا کہ انہوں نے مولانا کلیم اللہ جلبانی سے فرمایا کاپی لاؤ اور پھر انہیں عربی کا یہ شعر لکھ کر دیا:

تمتع من شمیم عِرار نجد
فما بعد العشیة من عرار

وادی نجد میں کھلنے والے (زرد) پھول ''عِرار'' کی خوشبو اچھی طرح سونگھ لو کیونکہ ایک رات کے لیے کھلنے والا ''عِرار'' بعد میں دکھائی نہیں دے گا۔

یہ شعر پڑھ کر مجھ پر بیقراری اور کرب کی ایک عجب کیفیت طاری ہوئی، مگر میں اپنی کیفیت کو ضبط کیئے رہا اور اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ وہ سفر آخرت کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔

ایک رجسٹر جس میں انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے ترجمۂ قرآن لکھا ہوا تھا، میں نے اُس رجسٹر کے ابتدائی صفحے پر دیکھا کہ اُن ہاتھ سے عربی کا یہ شعر لکھا ہوا تھا:

یلوح الخط فی القرطاس دهرا
و کاتبہ رمیم فی التراب

(تحریر صفحۂ قرطاس پر ایک مدت چمکتی رہتی ہے، جب کہ اُس کا لکھنے والا قبر میں مٹی ہو چکا ہوتا ہے۔)

یہ شعر پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ اپنے ترجمۂ قرآن اور دیگر تحریری کاموں کو بصد عجز و نیاز ربِ کریم کی بارگاہ میں بطور گواہ پیش کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ دہراتے ہوئے یہ دعا مانگ رہے ہیں:

وَ اجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْآخِرِیْنَ (سورہ شعراء:۸۴)

بعد میں آنے والی امتوں میں میرا ذکر خیر باقی (حسین تذکرہ جاری) رکھ۔(انوار الفرقان)

وہ جانتے تھے کہ اگر کریم رب اُن کی تدریسی، تصنیفی، تربیتی خدمات قبول فرمالے تو یہ سب کچھ نہ صرف اُن کے لیے بلکہ اُن کے والدین، اساتذہ اور مشائخ کے لیے بھی صدقہ جاریہ اور ذکرِ خیر کا سبب بنے گا۔

ہمارے سراپا اخلاص دوست محترم محمد ندیم حسن صاحب جو حضرت والد صاحب کے لیے ڈاکٹر سے ٹائم لیتے اور پھر ان کو ساتھ لے کر ہسپتال جاتے، واپسی پر گھر پہنچا کر جاتے، وہ بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ والد صاحب نے انہیں فرمایا:

''آپ کب تک مجھے اٹھائے پھرتے رہیں گے؟ آپ کو مجھ سے کیا ملنا ہے؟''

تو ندیم صاحب نے جواب میں کہا:

''جب تک مجھ میں سکت ہے اور آپ صحت یاب نہیں ہو جاتے تب تک میں یہ ڈیوٹی نبھاتا رہوں گا، اور مجھے آپ سے بہت کچھ ملے گا۔ اللہ کی توفیق سے یہاں اپنی کار میں آپ کو میں لیے پھرتا ہوں قیامت کے دن آپ ہمیں اپنے ساتھ رکھیئے گا۔''

ندیم صاحب کی اِس بات کا ردِعمل کیا تھا؟ وہ کہتے ہیں:

''حضرت شرف صاحب میری یہ بات سن کر یوں اُچھلے کہ اُن کا سر گاڑی کی چھت سے ٹکرا گیا۔''

پھر انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا:

''یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟''

پھر انہوں نے فرمایا:

''یہ بات ہے؟ تو پھر سنیئے! اگر مجھے بخشش نصیب ہوگئی تو اِن شاء اللہ ہم وہاں بھی اکٹھے رہیں گے، آپ نماز کی پابندی کیا کریں، جو رہ گئی ہیں وہ ہر نماز کے ساتھ قضا کیا کریں، اس کے علاوہ ہمیں ایک دوسرے سے فقط اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تعلق رکھنا چاہیے، یعنی مجھے آپ کے ساتھ صرف اِس لیے تعلق نہیں رکھنا چاہیے کہ آپ کے پاس گاڑی ہے، اگر ہمارا تعلق للہ فی اللہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہوگا اور ہمیں جنت اور وہاں کی رفاقت عطا فرمائے گا۔''

حضرت والد صاحب وصال سے کچھ عرصے قبل ندیم صاحب سے فرمایا:

:''ذرا حساب لگا کر بتائیں کہ میری عمر تریسٹھ سال ہوگئی ہے؟''
تب ندیم صاحب نے کہا ابھی نہیں ہوئی، لیکن والد صاحب کا اصرار تھا کہ اُن کی عمر تریسٹھ سال ہوگئی ہے، شاید آپ نے اپنے رب سے تریسٹھ سال کی عمر ہی مانگی تھی تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس سنت کی اتباع بھی ہو جائے۔

مولانا محمد اسلم شہزاد جو والد گرامی کی طبیعت میں بشاشت لانے کے لیے اُن کے ساتھ مؤدب بے تکلفی بھی کرلیا کرتے تھے، بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت استاد صاحب سے پوچھا:

''علامہ کریم سلطانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے تو میری درخواست پر جنت میں اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ فرمایا ہے، آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

یہ سوال سن کر مسکرائے اور خاموش ہوگئے، اُن کی دھیمی مسکراہٹ اور جھکی نگاہوں میں چھپا عجز وانکسار مجھے آج تک یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا۔''

والد صاحب کے قدیم ترین شاگرد مولانا حافظ عبد الغفور گولڑوی نے بتایا:

ایک مرتبہ میں نے استاد صاحب سے گزارش کی: ''جناب آپ اس زندگی میں شفقت فرماتے ہوئے اپنے پاس بٹھاتے ہیں، یہ شفقت جنت میں بھی اِسی طرح فرمائیے گا۔''

تو استادِ گرامی نے سراپا عجز وانکسار بن کر یوں جواب دیا:
''اگر میری بخشش ہوگئی تو اِن شاء اللہ ہم جنت میں بھی اکٹھے رہیں گے۔''

ایک عالم دین باپ کی عالمہ فاضلہ صاحبزادی نے ایک مرتبہ فون پر آپ کی خیریت دریافت کرتے ہوئے آپ سے درخواست کی:
''آپ میرے ساتھ وعدہ فرمائیں کہ آپ مجھے جنت میں ساتھ لے کر جائیں گے۔''

یہ انوکھا مطالبہ سن کر حضرت پر ایک عجب عجز وانکسار کی کیفیت طاری ہوگئی، آپ نے فرمایا:

''بچے یہ وعدہ یک طرفہ نہیں ہوگا بلکہ دو طرفہ ہوگا، جو جنت میں جائے گا وہ ربِ کریم کی بارگاہ میں دوسرے کے لیے شفاعت کرے گا۔''

عجز وانکسار پر مشتمل یہ کلمات سن کر اُس سراپا ادب بچی نے کہا:
''مجھے یقین ہے کہ میں ہی آپ کے پیچھے پیچھے جنت میں جاؤں گی۔''

میں تھوڑے فاصلے پر بیٹھا یہ گفتگو سن رہا تھا مگر خواہش کے باوجود مجھے یہ گذارش کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، اللہ تعالی مجھ گنہگار کو بھی جنت میں اُن کی رفاقت نصیب فرمائے۔

ایمان: خوف اور امید کی درمیانی کیفیت اور ایک توازن کا نام ہے، رحمت عالم ﷺ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا:

**ان العبد ليعمل عمل اهل النار وانه من اهل الجنة، ويعمل عمل اهل الجنة وهو من اهل النار، وانما الاعمال بالخواتيم .(رواه البخارى)**

بندہ دوزخیوں والے عمل کرتا ہے جب کہ وہ جنتی ہوتا ہے اور (کسی وقت) وہ جنتیوں والے عمل کرتا ہے، جب کہ وہ دوزخی ہوتا ہے، اعمال کا دارومدار خاتموں پر ہے۔

رحمت عالم ﷺ نے اللہ تعالی کی رحمت کی طرف بندوں کی احتیاج کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

**لن يدخل الجنة احد منكم بعمل، قالوا: ولا انت يا رسول الله؟ قال: ولا انا، الا ان يتغمدني الله منه برحمة و فضل.( رواه الامام مسلم فى صحيحه)**

کوئی شخص بھی جنت میں (فقط) عمل کی بدولت داخل نہ ہو سکے گا (حضرت ابن طارق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:) ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ کیا آپ بھی؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں میں بھی۔ مگر یہ کہ اللہ تعالی مجھے اپنی رحمت اور فضل وکرم سے ڈھانپ لے۔

اِس لیے ہر دور میں اہلِ علم وتقویٰ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار بھی رہے اور اُس کے خوف سے تھر تھر کانپتے بھی رہے، اُس کریم رب سے عدل کا نہیں بلکہ فضل کا سوال کرتے رہے، اور اُس کا خوف تو اہل علم کو ہی نصیب ہوتا ہے، خود کتابِ لاریب اِس بات پر گواہ ہے، ارشاد ربانی ہے:

آج اگر ہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی امید پر اُس کے خوف سے بے نیاز ہو جاتے ہیں تو یہ ہماری عقل کا فریب اور شیطان کا دھوکا ہے،

جاگو اور جگاؤ اُن کا مشن تھا، وہ دوسروں میں خوفِ خدا بیدار کرتے ہوئے خود اِس کیفیت سے بے نیاز نہیں تھے بلکہ بہت عجز و نیاز کے ساتھ شعوری طور پر اِس کیفیت سے سرشار تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف ''خدا کو یاد کر پیارے'' میں خاص طور پر اِس پہلو کو اُجاگر فرمایا اور اس تصنیف کا نام اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے اِس شعر سے لیا:

اندھیرا گھر، اکیلی جاں، دم گھٹتا، دل اُکتاتا
خدا کو یاد کر پیارے وہ ساعت آنے والی ہے

حضرت شرف قادری رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند شان اور ربِ کریم کی بارگاہ میں آپ کی قدر و منزلت، اپنی تقاریر میں بیان بھی کیا کرتے تھے اور اُن کی تصنیف 'عقائد و نظریات' بھی شانِ رسالت کے بیان پر مشتمل ہے، مگر انہوں نے اصلاحی نقطۂ نظر سے اپنی تصنیف ''خدا کو یاد کر پیارے'' میں اپنا ایک مضمون ''رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خشیتِ الٰہی'' بطور خاص شامل کیا، وہ اپنے اِس مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ جہت شخصیت کے دو بنیادی پہلو ہیں، رسالت و عبدیت، بعض مقررین حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور رفعتِ قدر کو تو بہت جوش و خروش سے بیان کرتے ہیں لیکن آپ کی شخصیت کے دوسرے پہلو کو غیر شعوری طور پر نظر انداز کر جاتے ہیں، یہ بات ہرگز مناسب نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف اللہ تعالیٰ کے حبیب اور مقرب بندے ہیں بلکہ خوفِ خدا رکھنے والے بندگانِ خدا کے بھی امام ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان عبدیت آپ کی بلند و بالا شان کے منافی نہیں، مذکورہ بالا مضمون مقررین کے ایک اہم پہلو خشیت الٰہی کی طرف مبذول کرانے کے لیے لکھا گیا ہے تاکہ عوام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس کے اس پہلو کی اتباع کا جذبہ پیدا ہو۔''

حضرت والد گرامی ہسپتال تشریف لے گئے اور ڈاکٹرز کو کیموتھراپی کرنی تھی، اِس دن میری طبیعت بے حد پریشان تھی، مجھے معلوم تھا کہ کیموتھراپی کے نقصانات بہت زیادہ ہوتے ہیں، حضرت والد گرامی گھر سے انمول ہسپتال روانہ ہوئے تو دعا فرمائی اور پھر سب سے مل کر بہت صبر اور بلند حوصلے کے ساتھ روانہ ہوئے، ڈاکٹرز نے چیک اَپ کے بعد بتایا کہ آپ کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہے اور جسمانی کمزوری بھی ہے، اِس لیے فی الحال کیموتھراپی نہیں کی جائے گی، آپ کچھ عرصے اچھی خوراک لیں، بعد میں دیکھیں گے۔

والد صاحب گھر واپس تشریف لائے تو انہوں نے مجھے فرمایا:
''ڈاکٹرز کی اِس بات کا تو مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جواب دے دیا ہے۔''

میں خود اِس پریشانی سے دوچار تھا اور مجھے خود بھی گھبراہٹ ہو رہی تھی، لیکن میں نے اُس وقت بہت ادب کے ساتھ والد گرامی سے گزارش کی:

''طبی علاج اپنی جگہ ہے، مگر آپ کا دعاؤں کے ذریعے روحانی علاج بھی ہو رہا ہے، علما و مشائخ اور عوام آپ کے لیے دعائیں کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کی دعائیں رَد نہیں فرمائے گا۔''

میری یہ گزارش بے بنیاد نہیں تھی، دراصل ہمارے فاضل دوست مولانا محمد اسلم شہزاد نے ماہنامہ رموز میں ان کے حوالے سے دعائے صحت کی اپیل شائع کی تھی، جس کے بعد پاک و ہند کے کئی مجلّات میں بھی دعائے صحت کی اپیلیں شائع ہوئیں، تب حضرت والد صاحب کو دعاؤں پر مشتمل بہت سے خطوط موصول ہوئے، کئی حضرات ملنے کے لیے آئے اور اِس طرح اُن کی صحت کے لیے دعاؤں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

حضرت شرف قادری دوسرے سلاسل طریقت کے مشائخ کا خود بھی دل کی گہرائیوں سے احترام فرماتے تھے اور اپنے احباب کو بھی تمام علما اور مشائخ کے احترام کی تلقین فرمایا کرتے تھے، نہ خود کسی کی تنقیص کرتے نہ کسی کو کرنے دیتے، مگر آپ کو محي الملة والدين حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی سے والہانہ محبت تھی، آپ کو اِس عقیدت و محبت اور قادری نسبت کی بہت سی برکات بھی حاصل تھیں، آپ اکثر اپنی محافل ذکر میں نعت شریف کے ساتھ ساتھ حضرت غوثِ اعظم کی منقبت کے کچھ اشعار ترنم سے پڑھا کرتے تھے، میں نے بہت مرتبہ آپ کو درج ذیل منقبت کے اشعار پڑھتے ہوئے سنا:

سرکارِ غوثِ اعظم نظر کرم خدا را
میرا خالی کاسہ بھر دو میں فقیر ہوں تمہارا

اِسی قادری نسبت کے پیش نظر ایک مرتبہ انہوں نے وصال سے کچھ عرصے قبل مجھے ایک چوکور ڈبیہ کھول کر دکھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

''جانتے ہو یہ کیا ہے؟''

وہ سبز رنگت والے کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا، میں نے اُس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا:

''یہ حضرت غوثِ اعظم کے مزارِ مبارک کی چادر کا ٹکڑا ہے، اِسے میرے کفن کے اندر رکھ دینا۔''

یہ بات سن کر میں تڑپ اٹھا اور مجھ پر گریہ طاری ہو گیا، تب والد صاحب میرا بازو تھام کر مجھے تسلی دے رہے تھے اور میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے فرما رہے تھے:

''جو بھی اِس دنیا میں آیا ہے، اُسے ایک نہ ایک دن تو لوٹ کر رب کی بارگاہ میں جانا ہی ہے، بے صبری مناسب نہیں ہے۔''

میں نے یہ کلمات نہ جانے کس حوصلے کے ساتھ سنے، میں اُن کے لہجے میں اطمینان پر اُس وقت بھی حیران تھا اور آج بھی حیران ہوں، بہر حال وقت گزرتا گیا اور پھر یہ بات ذہن سے اوجھل ہو گئی اور جس وقت آپ کو کفن دیا جا رہا تھا، میں فرقت کے صدمے سے اپنے آپ کو بھولا ہوا تھا، مگر اچانک اُن کی وصیت یاد آ گئی اور میں نے اُن کی امانت اُن کے حوالے کر دی، میں نے وہ امانت کفن اٹھا کر آپ کے سینے پر رکھ دی۔

موت کا تصور ہم گنہگاروں کے لیے خوفناک ہوتا ہے مگر اللہ رب العزت کے ذکر سے آشنا قلوب والے حضرات کے لیے رب کی بارگاہ میں حاضری کا تصور بہت سہانا ہوتا ہے۔ میں کبھی کبھار حضرت شرف ملت کے بعض رویوں کے بارے میں سوچتا تو مجھے بے حد حیرت ہوتی، میں نے انہیں دیکھا کہ وہ ایک ایسے شخص سے آگے بڑھ کر گلے مل رہے تھے جس نے کسی موقع پر اُن کے متعلق بعض نامناسب باتیں کہی تھیں، اب وہ شرم سے پانی پانی تھا۔ اِسی طرح وہ ایک روٹھی ہوئی شخصیت سے آگے بڑھ کر ملے تو اُن صاحب کی رنجش بھی شرمندگی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ کسی محترم شخصیت کے سخت کلمات سن کر بھی اُن کے صبر کا پیمانہ چھلکتا نہیں تھا۔ اعزہ واقارب میں سے کسی نے قطع رحمی کی تو آپ نے اُس سے صلہ رحمی کی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اقارب میں سے ایک شخصیت نے بیماری کے ایام میں انہیں پیغام بھیجا کہ آ کر مل جائیں۔ تب گھر کے بعض افراد نے انہیں روکنے کی کوشش کی، میں بھی اِسی نیت سے آگے بڑھا تو آپ نے مجھے فرمایا: حضور ﷺ فرماتے ہیں جو قطع رحمی کرے اُس کے ساتھ صلہ رحمی کرو اور یہ مجھے فلاں کے ساتھ ملاقات سے منع کر رہے ہیں، میں حضور ﷺ کی بات مانوں یا اِن کی بات مانوں؟ اس سوال نے مجھ سے وہ سارے لفظ چھین لیے جو میں بولنے سے پہلے تول رہا تھا، میرے لیے یہ سب کچھ حیران کن تھا۔

اِس کے علاوہ حضرت شرف ملت کی عاجزی وانکساری بھی تعجب خیز تھی، کینے سے اُن کے دل کا پاک ہونا اور سینے کا جوشِ انتقام سے خالی ہونا بھی باعث حیرت تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا:

''مجھے فلاں صاحب کے رویے سے جو تکلیف پہنچی ہے اُس کی وجہ یہ سمجھ آتی ہے کہ میری فلاں کتاب کے حوالے سے بہت سے تعریفی خطوط آنے کے باعث شاید میرے دل میں خود پسندی پیدا ہو گئی تھی، اللہ تعالیٰ نے فلاں صاحب کے سخت کلمات سے پہنچنے والی تکلیف کے ذریعے میرے دل سے خود پسندی کی کثافت دور فرما دی ہے۔''

وہ بیماری کی شدت میں بھی کمال کا ضبط اور حوصلہ رکھتے تھے اور عجز وانکسار کی انتہا کو پہنچ کر اپنی تکلیف اور بیماری کو شامت اعمال قرار دیتے تھے۔ اگر عمر بھر قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بلند کرنے والے کی تکالیف شامت اعمال کا نتیجہ تھیں تو مصائب اور تکالیف کے ذریعے کن لوگوں کے درجات بلند ہوتے ہیں؟ مجھے یہ سب کچھ سمجھ نہیں آتا تھا، لیکن اُن کے وصال کے بعد سمجھ آنے والے کئی امور میں سے ضبط، استقامت اور عجز وانکسار کا فلسفہ بھی سمجھ آ گیا۔ ایک دن اچانک جیسے کوئی روشنی پھوٹی ہو، مجھے یہ بات شرح صدر کے ساتھ سمجھ آئی کہ حضرت نے اپنے صبر وضبط اور استقامت کے ذریعے ''موتوا قبل اَن تموتوا'' کا مقام حاصل کر لیا تھا تب ہی آپ کو مثالی عاجزی اور انکساری نصیب ہوئی تھی۔ آپ نے اپنا وصیت نامہ ۳۱ر جولائی ۲۰۰۷ء سے ہی لکھ رکھا تھا، چنانچہ ۱۸ شعبان ۱۴۲۸ھ بمطابق یکم ستمبر ۲۰۰۷ء کو یا ایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیہ کی صدائے دلنواز سنتے ہوئے اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے اور ہم اُن کی نظر آنے والی شفقتوں اور محبتوں سے محروم ہو گئے۔

❑❑❑

☆ لیکچرار: منہاج القرآن یونیورسٹی، لاہور (پاکستان)